© rasailojaraid.com

اداریہ

شناختی کارڈ میں مذہب کا اندراج

گزشتہ چند ماہ سے وطنِ عزیز کے اخبارات میں بحث و مباحثہ جاری ہے کہ شناختی کارڈ میں مذہب کا اندراج ہونا چاہیے یا نہیں؟ مرکزی مجلسِ عمل تحفظ ختمِ نبوّت کی شکل میں منظّم، دینی قوتیں دستوری اور قانونی تقاضوں کی تکمیل کے لیے شناختی کارڈ میں مذہب کا اندراج ضروری خیال کرتی ہیں، مگر یہ بات اقلیتی رہنماؤں اور ان سے زیادہ وطنِ عزیز کے لبرل سیکولر طبقے کو پسند نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بات آئینی اور قانونی حوالوں سے بڑھ کر احتجاجی مظاہروں، بھوک ہڑتالوں اور قوّت کے اظہار تک پہنچ گئی ہے اور جذبات ہیں کہ بپھرے چلے جا رہے ہیں۔

جہاں تک لبرل سیکولر طبقے کا تعلق ہے، پاکستان کے عوام (جنھوں نے دین کے لیے قربانی دینے سے کبھی دریغ نہیں کیا) اور اس طبقے کے درمیان کشمکش کوئی نئی بات نہیں۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جب اس طبقے کو اقتدار کے ایوانوں میں مؤثر قوّت حاصل تھی، اس نے اپنی سی کوشش کی کہ پاکستان کی شناخت ایک اسلامی ریاست کے طور پر نہ ہو سکے مگر اس "ذہین طبقے" نے اسلام کی کھلی مخالفت کی بجائے کبھی "مُلّائیت" کو تنقید کا نشانہ بنایا اور کبھی "عالمی معیاروں" کی دہائی دی، تاہم ۴۵ سال کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ سیاسی زندگی میں جب بھی عوام کو بھرپور اہمیت حاصل ہوئی، لبرل سیکولر طبقے کو خاموشی اختیار کیے بغیر چارہ نہ رہا۔ ۱۹۵۳ء میں وزیراعظم پاکستان، "الحاج" جن کے نام کا جزو بن گیا تھا، مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں کے بارے میں جمہور مسلمانوں کا وہ مطالبہ تسلیم نہ کر سکے جو ستمبر ۱۹۷۴ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے منظور کر لیا۔ مارشل لاء کی چھتری تلے بننے والے دستور (۱۹۶۲ء) میں جمہور مسلمانوں کی امنگوں کے خلاف پاکستان کو ایک سیکولر ریاست دکھانے کی کوشش کی گئی مگر لبرل سیکولر طبقے کی یہ کامیابی اس وقت نقش برآب ثابت ہوئی جب دستور کے خالق "فردِ واحد" کو قومی اسمبلی کا سامنا کرنا پڑا، اگرچہ یہ اسمبلی بہت حد تک "قابو یافتہ جمہوریت" (Controlled Democracy) کے تحت وجود میں آئی تھی۔ ۱۹۶۲ء کے دستور میں وہ ساری اسلامی دفعات شامل کر لی گئیں جو ۱۹۵۶ء کے دستور میں موجود تھیں اور جن پر جمہور مسلمانوں نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔

۱۹۶۲ء کے اس تجربے کے بعد آنے والے حکمرانوں نے یہ سبق سیکھ لیا کہ اقتدار پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ جمہور مسلمانوں کے دینی جذبات کو اہمیت دی جائے۔ اس لیے انہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے خود اس طبقے کا فرد ہونے یا اس طبقے کی تائید و حمایت رکھنے کے باوجود جمہور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو نظر انداز نہ کیا۔

شناختی کارڈ کے حوالے سے رواں بحث مباحثہ کے ایک فریق، دینی قوتوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۷۴ء میں جب مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا، ان کے لیے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں نشستیں مخصوص کر دی گئیں تو ان کی الگ "شناخت" بھی ضروری تھی۔ ان کا معاملہ پاکستان کی دوسری غیر مسلم اقلیتوں سے اس لیے مختلف ہے کہ ناموں سے لے کر بودو باش اور مذہبی مراسم تک مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار جمہور مسلمانوں کے قریب ہیں۔ (ستم ظریفی کی حد یہ ہے کہ مرزا صاحب نے "نبی" اور "مسیح موعود و مہدی معہود" کے دعووں کے باوجود اپنے اور اپنی امت کے لیے فقہ حنفی کی تقلید ضروری قرار دی ہے۔)

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے دینی قوتوں کے نقطۂ نظر کی معقولیت کے پیشِ نظر شناختی کارڈ کے حوالے سے رجسٹریشن ایکٹ میں ترمیم کی اور شناختی کارڈ کے ہر درخواست کنندہ کے لیے فارم میں لازم قرار دے دیا گیا کہ وہ اپنے مذہب کا اظہار کرے اور اپنے مسلم ہونے کے بارے میں ایک حلف نامہ پر دستخط کرے۔ شناختی کارڈ کے لیے درخواست فارموں پر یہ سب کچھ موجود ہے مگر شناختی کارڈ پر مذہب کا اندراج اس لیے نہ ہو سکا کہ ۱۹۷۴ء سے پہلے کروڑوں افراد کو کارڈ جاری ہو چکے تھے اور کارڈوں کے دوبارہ اجراء پر قومی خزانے پر ناروا بوجھ پڑتا۔ دینی قوتوں نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کے اس وعدے پر اعتبار کیا کہ موزوں وقت پر شناختی کارڈ میں مذہب کا اندراج ہو جائے گا۔

اس کے بعد وطن عزیز نشیب و فراز سے گزرتا رہا مگر کسی موقع پر یہ محسوس نہ کیا گیا کہ شناختی کارڈ کا اجراء از سر نو کیا جائے۔ حالیہ حکومت نے بعض انتظامی مجبوریوں کے تحت فیصلہ کیا کہ جعلی شناختی کارڈوں کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ تمام کارڈ کمپیوٹرائزڈ ہوں چنانچہ اس موقع پر مرکزی مجلسِ عمل تحفظ ختمِ نبوّت نے حکومت کو اس جانب توجہ دلائی کہ شناختی کارڈ میں مذہب کا اندراج ہو جانا چاہیے۔ وفاقی حکومت جس میں دینی قوتوں کی موثر آواز موجود ہے، مگر لبرل سیکولر لابی بھی بہت کمزور نہیں، اپنی اندرونی تقسیم کے باعث شناختی کارڈ کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ نہ کر سکی اور مرکزی مجلسِ عمل تحفظ ختمِ نبوّت نے اسلام آباد میں احتجاجی مظاہرے کا پروگرام بنایا (۱۴ اکتوبر ۱۹۹۲ء) مگر اس سے پہلے کہ جمہور مسلمان جذبات کے اظہار کے لیے سڑکوں پر آتے، وفاقی حکومت نے مرکزی مجلسِ عمل تحفظ ختمِ نبوّت کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔

لبرل سیکولر طبقے نے، جو تعداد کے لحاظ سے محدود مگر ذرائع ابلاغ کی حد تک خاصا موثر ہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شناختی کارڈ میں مذہب کے اندراج کو پاکستان کا مسئلہ نمبر ایک بنا دیا۔ حالانکہ یہ کوئی ان ہونی یا نئی بات نہیں ہے۔ سعودی عرب تو ایک طرح کی مذہبی پہچان رکھتا ہے مگر انڈونیشیا کے حکمرانوں کو اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں، مگر ان دونوں ملکوں میں شناختی کارڈ پر مذہب کا اندراج موجود ہے اور وہاں مذہب کے حوالے سے کوئی امتیازی سلوک بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں کسی طبقے سے امتیازی سلوک بنیادی طور پر ایک سماجی مسئلہ ہے، سیاسی نہیں۔ دستور اور قوانین کی حد تک مساوی حیثیت پر کتنا ہی زور کیوں نہ دیا جائے، اگر معاشرتی طور پر فضا اس کے حق میں نہیں تو کاغذی مساوات کبھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔ اور اگر معاشرہ رواداری، برداشت اور فراخ دلی کی خوبیوں سے متصف ہے تو شناختی کارڈ پر مذہب کا اندراج کوئی مسئلہ پیدا کرنے کی جگہ پیچیدگیاں دور کرنے کا باعث ہوگا۔

اقلیتی رہنماؤں کے احتجاجی بیانات اور مضامین میں جو باتیں سامنے آئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ پاکستان کو سرے سے اسلامی ریاست ہی نہیں ہونا چاہیے اور ان کے اس نقطۂ نظر کی بنیاد قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا وہ اقتباس ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "کاروبار حکومت سے مذہب، ذات یا عقیدے کا کوئی تعلق نہیں۔" مگر ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے اور اس کے بعد کی بیسیوں تقاریر اقلیتی رہنماؤں کے پیش نظر نہیں۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد قائداعظم تقریباً ایک سال گورنر جنرل رہے اور انہوں نے کئی مواقع پر پاکستان کے نظامِ حکومت اور دستور کے بارے میں گفتگو کی۔ کیا ہی بہتر ہو کہ جملہ تقاریر کو مجموعی طور پر دیکھتے ہوئے کوئی رائے قائم کی جائے اور مجموعی رائے یقیناً اقلیتی رہنماؤں کے اس مطالبے کے خلاف ہے کہ پاکستان ایک سیکولر ریاست ہو جس میں اسلام کا کوئی رول نہ ہو۔

اقلیتی رہنماؤں میں سے بعض پاکستان کی اس حیثیت کو تو چیلنج نہیں کرتے کہ یہ اسلامی ریاست ہے اور جمہور مسلمانوں نے اسی مقصد کے لیے تقسیم ہند کی بے مثال تحریک چلائی تھی مگر ان کا دعویٰ ہے کہ تقسیمِ ہند کی اس جدوجہد میں وہ مسلمانوں کے ساتھ تھے۔ تحریکِ پاکستان میں شامل کارکن تو ایک طرف، اس تحریک کے طالب علم بھی اس دعوے کو چنداں اہمیت نہ دیں گے۔ کسی خاص موقع پر جب مسیحی آبادی کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، مسلم لیگ کے حق میں رائے دینا اسے تحریکِ پاکستان میں برابر کا شریک نہیں بنا سکتا اور شاید تحریکِ پاکستان کی کامیابی کو کسی "اقلیت" کے کھاتے میں ڈالنے کا ردعمل ہے کہ تحریکِ پاکستان کے ایک کارکن مولانا عبدالستار خان نیازی نے یہ کہا ہے کہ مسیحیوں نے قیامِ پاکستان کے لیے جدوجہد نہیں کی۔ مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنا چنداں درست نہیں کہ مسیحیوں کو پاکستان میں بطور شہری حقوق حاصل نہیں۔ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کو جو حقوق دیتی ہے، غیر مسلم آبادی ان سے فائدہ اٹھانے کا بنیادی حق رکھتی ہے۔

اقلیتی رہنماؤں کی جانب سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ شناختی کارڈ میں مذہب کے اندراج سے "قومی یک جہتی متاثر ہوگی، ملک تعصبات کی لپیٹ میں آجائے گا اور قومی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔" غور طلب امر یہ ہے کہ ووٹر لسٹوں کی علیحدگی، اقلیتوں کی مخصوص نشستوں، پاسپورٹ میں مذہب کے اندراج، شناختی کارڈ کے فارم حتیٰ کہ اسکولوں کے فارم داخلہ میں مذہب کے اندراج سے قومی یک جہتی موجود رہتی ہے تو شناختی کارڈ میں مذہب درج ہوجانے سے یہ ڈر کیوں ہے؟

اقلیتی رہنماؤں کو پاکستان کے لبرل سیکولر طبقے کی جانب سے اٹھائے گئے موہوم خدشات اور اندیشوں سے نکالنے کی ضرورت ہے اور اس مقصد کے لیے دینی قوتوں کو چاہیے کہ وہ براہ راست اقلیتی رہنماؤں سے رابطہ قائم کریں اور اسلامی ریاست میں اقلیتوں کو جو مثالی عزت و احترام حاصل ہے، اس کا عملی مظاہرہ کریں۔ اسی طرح اقلیتی رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ احتجاج کی سیاست اختیار کر کے جمہور مسلمانوں کو اپنے بالمقابل کھڑا دیکھنے کی بجائے افہام و تفہیم سے کام لیں اور پاکستان کے مسلمانوں کو ان کی جدوجہد سے فیض یاب ہونے دیں۔

© rasailojaraid.com